POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 September 2025, R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511
Total Pages 8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 86 واں سال

Date of Publication: 09-09-2025 • Price: 5/- • 15-21 September 2025 • Issue: 35 • Vol:84
۱۵ تا ۲۱ ستمبر ۲۰۲۵ء • شمارہ: ۳۵ • جلد: ۸۴

# اُردو ہے جس کا نام

### نصیر الدین شاہ ——— ترجمہ: عبداللہ زکریا ندیم

’زبان کا تعلق خطّے سے ہوتا ہے، مذہب سے نہیں‘، یہ بات جاوید اختر صاحب نے ایک انٹرویو میں کہی تھی جس کی صداقت پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ کچھ دن پہلے مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے اپنی بے پایاں دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک سمینار صرف اس لیے منسوخ کر دیا کیوں کہ اس میں جاوید اختر شریک ہونے والے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ خود اکیڈمی نے ہی انھیں اس سمینار میں مدعو کیا تھا۔ انھیں ’شیطان، کافر‘ کہہ کر (یہ جاوید صاحب کے مخالفین کے الفاظ ہیں، میرے نہیں) نہ صرف اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری بلکہ انھوں نے خود بھی تصور کرلیا کہ انھیں اپنے اس عمل کی وجہ سے ثوابِ جاریہ بھی ملے گا۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے — پہلے جاوید اختر کو مدعو کرنے اور بعد میں ان کی عدمِ شرکت کو یقینی بنانے کے لیے سمینار ہی کو کینسل کرنے — اس فیصلے پر سوال اٹھانے والا میں اکیلا شخص نہیں ہوں۔ اکیڈمی سے میرے معروضات یہ ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ سب لوگ جو جاوید صاحب کی مخالفت کررہے ہیں، ان کے نظریات سے واقف بھی ہیں۔ جاوید صاحب ہمیشہ مذہبی انتہاپسندی (کسی ایک مذہب کی نہیں) کے بارے میں کھل کر بات کرتے رہے ہیں لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، حالیہ دنوں میں انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جسے مسلمانوں کے لیے اشتعال انگیز کہا جا سکے اور جس کی بنیاد پر ’ان سچے ایمان والوں‘ کا غصہ یوں بھڑک اٹھے، جس کا مظاہرہ کلکتے میں ہوا۔ جاوید صاحب کے خلاف جو زبان استعمال کی گئی وہ افسوسناک بھی تھی اور غیر مہذب بھی۔

اکیڈمی کی نمائندگی کرنے والوں نے صرف اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے حسد اور انا کا جذبہ رہا ہو۔ یہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ پاک اور مقدس سمجھنے کا شاخسانہ بھی ہوسکتا ہے۔

اس بات کا بھی پورا امکان ہے کہ یہ اچانک اور حیران کن فیصلہ نہ صرف پبلسٹی کے لیے کیا گیا ہو جس کے پس پشت ایک پڑھے لکھے، منفرد اور انسائیکلوپیڈیا جیسی معلومات رکھنے والے شخص — جاوید اختر — کی توہین بھی مقصود تھی۔

جاوید صاحب کو نہ صرف بے شمار موضوعات پر قابلِ رشک گرفت حاصل ہے بلکہ بمبئی کی فلم انڈسٹری، اردو ادب، اس کی تاریخ، ارتقا، اور مستقبل کے بارے میں بھی ان کا علم بے مثال ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات اور عقائد کو کبھی پردۂ خفا میں نہیں رکھا۔

اگر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کو شروع میں ہی معلوم تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو بلا رہی ہے جسے روایتی سانچوں میں نہیں فٹ نہیں کیا جاسکتا، تو پھر انھیں بلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

اکیڈمی نے تقریب منسوخ کرنے کی جو وجہ بتائی ہے، وہ اتنی کمزور اور لچر ہے کہ ہنسی آتی ہے۔ شاید وہ اردو کو صرف ان شدت پسند مسلمانوں کی زبان سمجھتی ہے جو خود اپنے خیال میں دین پر سختی سے عمل پیرا ہیں حالاں کہ یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ متحدہ پنجاب میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو شامل تھی، اور آج بھی شمالی پنجاب میں اردو رسمِ خط میں شائع ہونے والے اخبارات سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

کیا مغربی بنگال اردو اکیڈمی کو، جس کے قیام کا مقصد ہی اردو کا فروغ ہے، احساس ہے کہ اس کے اس فیصلے نے اردو کو کتنا نقصان پہنچایا ہے؟ اکیڈمی کے اس فیصلے سے یہ تاثر اور مضبوط ہوگا کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے؛ یہ صرف ان مسلمانوں کی زبان ہے جو خود کو ایسا ’نیک‘ بھی سمجھتے ہیں جس کا مطلب شدت پسندی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ کاش معترضین کی مخصوص برادری کو، یہ بات سمجھ میں آجائے کہ جاوید اختر کا نجات پانا یا جہنم رسید ہونا جاوید اختر صاحب کا ذاتی معاملہ ہے، ان مومنین کو اس فکر میں غلطاں ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اکیڈمی کے اس قدم سے وہ چند لوگ بھی اردو سے دور ہو جائیں گے، جو اسے سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ کہیں گے: ’ہم اردو کیوں سیکھیں، یہ تو شدت پسندوں کی زبان ہے!‘ کیا واقعی ہمیں پہلے سے موجود تقسیم کو مزید وسعت دینے اور گہرا کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا اندھی عقیدت ہی اردو کی پہچان کا واحد سہارا رہ گئی ہے؟

جہاں تک جاوید صاحب کی لامذہبیت کو تقریب کی منسوخی کی وجہ قرار دینے کا تعلق ہے، تو یہ دلیل نہایت ہی کمزور ہے۔ جاوید صاحب کا مبینہ طور پر

’زبان کا تعلق خطّے سے ہوتاہے، مذہب سے نہیں‘، یہ بات جاوید اختر صاحب نے ایک انٹرویو میں کہی تھی جس کی صداقت پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی۔ کچھ دن پہلے مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے اپنی بے پایاں دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک سمینار صرف اس لیے منسوخ کر دیا کیوں کہ اس میں جاوید اختر شریک ہونے والے تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ خود اکیڈمی نے ہی انھیں اس سمینار میں مدعو کیا تھا۔

قارئین! اب ’ہماری زبان‘ کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

'وندے ماترم' کہنا یا 'بھارت ماتا کی جے' بولنا یا 'اسلام کے بعض شعائر پران کی تنقید' کوان کے خلاف ہتھیار کے طور پر قطعی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تنقید مذہب کے خود ساختہ محافظوں پر ہے نہ کہ بجائے خود مذہب پر۔ مادرِ وطن کا احترام کرنے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ کیا صرف وہی لوگ جو خدا پر یقین رکھتے ہیں، معاشرے کی فلاح و بہبود میں حصہ لے سکتے ہیں؟ تعلیم کا قادرِ مطلق کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کیا تعلق ہے؟ یہ تمام سوالات مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے ذمے داروں سے پوچھے جانے چاہئیں۔ برٹنڈ رسل جو علی الاعلان خود کو ملحد کہتے تھے، کیا ان کی تمام تحریروں کو آگ کے حوالے کر دینا چاہیے؟ کیا جارج برنارڈ شا جنت اور جہنم کا مذاق اڑانے پر ابدی آگ میں جلتے رہیں گے؟ اور کیا ہم اس دائرے کو بڑھاتے ہوئے منشی پریم چند تک بھی لے جائیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ اور سردار راجندر [سنگھ] بیدی یا فراق گورکھپوری یا سعادت حسن منٹو کا کیا ہوگا؟ وہ بھی تو معتقد (believer) نہیں تھے۔ گمان غالب ہے کہ ان بے مثال اردو مصنّفین کو بھی، اگر وہ آج زندہ ہوتے، مغربی بنگال اردو اکیڈمی اپنی بات کہنے کا موقع نہیں دیتی۔ کیا مقدس کتاب پر مخصوص لوگوں کے مسلک اور طریقے کے مطابق ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ عمر بھر اردو سے دل بستگی رکھنے اور اس کا گہرا مطالعہ کرنے والے غیر مسلم اہلِ علم کو ہم اردو کے دائرے سے راندۂ درگاہ کر دیں؟ مثال کے طور پر آئرلینڈ کے کیتھولک پروفیسر وکٹر کیئرنن، جو اردو اور فارسی کے جید عالم تھے، یا پھر گوپی چند نارنگ کو جو بلاشبہ مسلمان نہیں تھے، اِلّا یہ کہ انھوں نے زندگی بھر اپنے ایمان کو صیغۂ راز میں رکھا ہو، جیسے لوگوں کا ایسے شدت پسند اردو والے کیا کریں گے؟

غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل کہکشاں ہے جنھوں نے اردو کی نشو ونما میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد یا برج نرائن چکبست جیسے لازوال قلم کاروں نے مذہبی اشتراک اور ہم آہنگی کا درس دیا اور اپنے فن کے ذریعے اپنے عہد کی سچی عکاسی کی۔ منشی نول کشور جیسے اردو کے سرپرست کو کون بھول سکتا ہے۔ اردو میں اشاعت کی نئی جہتوں کو متعارف کرانے کا سہرا ان کے سر ہے۔ اور آج کے دور میں گلزار صاحب کو بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے؟ جس فضا میں گلزار صاحب سانس لے رہے ہیں اسی فضا میں ہم ایسوں کا سانس لینا ایک سعادت ہے۔

گلزار صاحب کا ذکر آیا تو ایک اور غیر مقلد کی یاد آئی: غالب، جن کی شراب سے رغبت اور اس کے لیے خدا سے دعاؤں کے ذریعے سودے بازی کرنا، ہمارے شعور اور ہماری روایت (legend) کا حصہ بن چکا ہے۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بہتر تو یہی ہوگا کہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی ہر وہ تقریب منسوخ کر دے، جو غالب کی شاعری سے منسوب ہو کہ وہ تو اتنے 'گستاخ' تھے کہ یہ کہہ گئے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

◆◆

---

# مدھیہ پردیش میں اردو صحافت

## عارف عزیز

ریاست مدھیہ پردیش کی جن چار یونٹوں سے مل کر تشکیل ہوئی ہے، اُن میں بھوپال ریاست، مدھیہ بھارت، وندھیہ پردیش اور مہاکوشل شامل ہیں۔ آزادی سے قبل اور اُس کے بعد تک یہاں اردو کا رواج تھا خاص طور پر سابق بھوپال ریاست اور مدھیہ بھارت میں اردو مقامی عوام کی زبان تھی۔ اِس ہندی بھاشی ریاست کا قیام 1956 میں لسانی ریاستوں کی تشکیل کے وقت ہوا، لیکن اِس کے چاروں یونٹوں میں جغرافیائی قربت پہلے سے موجود تھی اور اِسی لیے پچاس سال سے زیادہ عرصے تک یہ ایک منظّم و متحد ریاست کی حیثیت سے ہندستان کے نقشہ پر قائم رہی، بعد میں اِس کے دو حصے مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ ہو گئے۔

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کی ابتدا انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اندور سے ہوئی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں کے بقول:

> ''مدھیہ پردیش کا سب سے قدیم اور معلوم اخبار ہفتہ وار 'مالوہ اخبار' ہے جو مہاراجا اندور اور مسٹر ہیملٹن ریزیڈینٹ آف اندور کی زیرِ سرپرستی، زیرِ ادارت دھرم نرائن 1849 میں اندور سے جاری ہوا، آٹھ صفحات پر مشتمل اِس اخبار کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے کالم میں ہندی میں خبریں شائع ہوتی تھیں، جن کا تعلق اندور کے علاوہ گرد و نواح کی دیگر ریاستوں سے بھی تھا، جناب عتیق احمد صدیقی نے اپنی کتاب 'صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات' صفحہ 77 میں 'مالوہ اخبار' کی چھ سالہ اشاعت کا نقشہ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ اخبار تقریباً 6 سال 1855 تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ مدھیہ پردیش کا دوسرا قدیم اخبار 'گوالیار اخبار' ہے۔ یہ سرکاری اخبار 1853 میں لکشمی پرشاد کی زیرِ ادارت گوالیار سے جاری ہوا، دو کالم پر مشتمل اس اخبار میں بھی ہندی، اردو دونوں زبانوں میں خبریں شائع ہوتی تھیں''۔

(ڈاکٹر محمد نعمان خاں: 'بھوپال ادب کے آئینے میں'، ص:98-97، 1994)

مدھیہ پردیش کے قدیم اخبارات و رسائل میں 'رتن پرکاش' (رتلام)، 'محتشم جاورہ' (جاورہ) کے علاوہ 'افتخار' اور 'انتخاب' شامل ہیں۔ 'رتن پرکاش' اِتنا معیاری جریدہ تھا کہ اُس کے مضامین 'اودھ اخبار' اور 'اخبارِ عالم' میں نقل ہوئے، 'حسنِ خیال' سیہور سے علامہ محوی صدیقی کی نگرانی میں نکلا اور 'اخلاق' گوالیار سے عبدالغفور کی زیرِ ادارت 36 سال تک شائع ہوتا رہا۔ بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والا پہلا مطبوعہ اور دستیاب اخبار ہفت روزہ 'عمدۃ الاخبار' ہے، جسے حکیم اصغر حسین اخگر نے 1871 میں شروع کیا، عبدالسلام خورشید کی تحقیق کے مطابق یہ کئی سال تک شائع ہوتا رہا، لیکن 'عمدۃ الاخبار' سے پہلے بھی ایک قلمی اخبار کا سراغ ملتا ہے جو 1857 کی جنگِ آزادی کے دوران ولی شاہ نامی ایک باغی سپاہی نے نکالا تھا۔ مظفر رئیس اپنے مضمون مطبوعہ ہفت روزہ 'ایاز' (بھوپال نمبر) 1972 میں لکھتے ہیں کہ ''اِس بے نامی اخبار میں ولی شاہ روزانہ حالاتِ حاضرہ پر ایک تازہ مضمون تحریر کر کے اپنے ساتھی سپاہیوں کو سناتا تھا اور اِسے بھوپال کا پہلا بے باک صحافی تسلیم کیا جا سکتا ہے''۔ عتیق احمد صدیقی نے 'بھوپال اخبار' کے نام سے ایک اور اخبار کی اشاعت کا حوالہ دیا ہے لیکن اِس کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں۔

مذکورہ اخبارات کے علاوہ بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والے اخبارات و رسائل میں ہفت روزہ 'دبیر الملک'، 'صداقت'، 'موجِ نربدا'، 'ہلال'، 'مظفری'، 'اخترِ ہند'، صفیر عام'، 'صبح وطن'، 'مزدور'، 'شاہ کار'، 'آواز'، 'رہبرِ وطن'، 'عرفان'، 'شاہکار'، نیا بھوپال' اور 'مالوہ ریویو' اہمیت کے حامل ہیں۔ آخر الذکر اخبار 1913 میں نکلا، اِس کے مدیر معروف مورّخ سید محمد یوسف قیصر اور کامدار عبدالمتین تھے۔ اِس زمانے میں 'والا جاہی' (مدیر امجد علی اشہری)، 'گلبنِ سخن' (عبدالشکور اخلاص)، 'گلِ رعنا' (نورالحسن سارنگ پوری)، 'مہرِ منیر' (ارجمند محمد خاں)، 'ظل السّلطان' (محمد امین زبیری)، 'الریاض' (ریاض الدین)، 'محسن الملک' (حامد سعید خاں)، 'نگار' (نیاز فتح پوری) 'جادہ' (کوثر چاندپوری) جیسے ادبی رسائل کی اشاعت بھی ہوئی، بھوپال ریاست کی آخری بیگم نواب سلطان جہاں تعلیمِ نسواں اور خواتین کی بیداری کی زبردست حامی تھیں لہٰذا اُن کی تحریک پر خواتین کے کئی رسائل شائع ہوتے رہے۔ 'الحجاب'، 'بانو'، 'امہات' اور 'آفتابِ نسواں' نے ملک گیر شہرت و مقبولیت حاصل کی، اِسی دور کا اہم رسالہ 'ندیم' ہے جسے 1922 میں سعید اللہ خاں رزمی نے شروع کیا۔

اِس لحاظ سے مدھیہ پردیش کی اردو صحافت کی تاریخ ہندستان کے تناظر میں 27 برس پیچھے ہے تاہم 2016 تک کوئی 167 سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ مادھوراؤ سپرے سنگھرالیہ بھوپال کی مرتبہ فہرست 'مدھیہ پردیش میں اردو اخبارات' از شوکت رموزی، مطبوعہ 1989 کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اِس عرصے میں پورے مدھیہ پردیش سے بحیثیت مجموعی 301 اردو کے اخبارات و جرائد شائع ہوئے، جن میں سے اگست 1947 تک منظرِ عام پر آنے والے اخبارات میں 3 روزنامے، ایک سہ روزہ، 78 ہفت روزہ، 9 پندرہ روزہ، 28 ماہنامے، 2 سالنامے (اِن کی مجموعی تعداد 121 ہوتی ہے) شامل ہیں۔ مذکورہ اخبارات و رسائل میں سے 88 کی اشاعت بھوپال سے ہوئی اور باقی 33 ریاست کے دوسرے شہروں سے نکلتے رہے، اِس طرح ملک کی آزادی تک اردو اخبارات نے یہاں کی سیاسی و سماجی ترقیات میں بھرپور حصّہ لیا اور اپنا ایک مقام بنایا۔

### اردو صحافت آزادی کے بعد:

مدھیہ پردیش میں اردو صحافت کا یہ کارواں آزادی کے بعد بھی

پوری سرگرمی کے ساتھ رواں دواں رہا اور 69 سالہ مدت (1947 تا 2016) میں ریاست کے دارالحکومت بھوپال اور دیگر شہر گوالیار، جبلپور، سیہور، کھنڈوہ، اندور، مہو، رتلام، برہانپور، ساگر، شیوپوری، بلاسپور، جاورہ اور سرونج وغیرہ میں اخبارات کی جو اشاعت ہوئی، اُن کی مجموعی تعداد اگرچہ 204، لیکن 165 صرف بھوپال سے منظرِ عام پر آئے اور مدھیہ پردیش بننے سے پہلے یا بعد میں بھوپال ہی اردو صحافت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت سے اُبھرا، جہاں سے 2016 میں بھی روزنامے ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامے اور سہ ماہی نکل رہے ہیں۔ 1935 سے ہفت روزہ کی حیثیت سے شروع ہونے والے 'ندیم' کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ 1938 سے یہ اخبار روزنامہ ہوگیا اور مسلسل شائع ہورہا ہے، اِسے بھوپال کا پہلا روزنامہ اور 1949 تک ریاست کا نیم سرکاری اخبار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس کے مدیروں میں محمودالحسن صدیقی، ڈاکٹر تیموری، حکیم سید قمرالحسن اور قمر اشفاق کے نام شامل ہیں۔ اکیاسی سال سے مسلسل شائع ہونے کا اعزاز بھی اِسے حاصل ہے۔

بھوپال سے منظرِ عام پر آنے والا دوسرا قابلِ ذکر روزنامہ 'افکار' ہے، جو آزادی سے پہلے 1945 سے 1946 تک ادبی ماہنامے کی حیثیت سے نکل کر بند ہوگیا۔ 1951 میں دوبارہ روزنامہ کی حیثیت سے اے آر رُشدی اور اشتیاق عارف کی اِدارت میں شروع ہوا اور چوبیس سال تک مسلسل شائع ہوکر 1976 میں تین ماہ کے لیے اِس کی اشاعت موقوف ہوگئی، سہ بارہ صغیر بیدار اور عیسیٰ صدیقی کی زیرِ ادارت صبح کے اخبار کی حیثیت سے نکلنے لگا، درمیان میں دوبارہ اشتیاق عارف اور کچھ عرصے کے لیے مقصود عمرانی اِس کے ایڈیٹر رہے۔ 'افکار' کا آخری دور 1986 میں راقم (عارف عزیز) کی اِدارت میں شروع ہوا لیکن ملکیت کے ایک تنازع کا شکار ہوکر سوا سال میں بند ہوگیا۔

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش سے تیسرا روزنامہ 1963 میں صنعتی شہر اندور سے شائع ہوا، اِس کے ایڈیٹر عبدالغفور مجاہد اور اداریہ نگار عزیز اندوری تھے۔ 14X50 کے سائز پر یہ تین سال 1966 تک جاری رہا، روزنامہ 'الحمراء' کو 1946 میں ڈاکٹر خلیل بدر بطورِ ہفت روزہ نکال چکے تھے، تین سال بعد اُنھوں نے اِسے دوبارہ روزنامے کی حیثیت سے شروع کیا، لیکن بھوپال ریاست میں اُس وقت چیف کمشنری راج نافذ ہوگیا تھا لہٰذا اخبار پابندیوں کا مقابلہ نہیں کرسکا اور بند ہوگیا، 'الحمراء' کا تیسرا دور سید محمود الحسینی کی اِدارت میں 1978 تک جاری رہا، عوامی اخبار کی حیثیت سے اِسے مقبولیت بھی ملی لیکن بھاسکر گروپ کا اعلا وسائل یافتہ روزنامہ 'آفتابِ جدید' شائع ہوا تو 'الحمراء' اِس کا مقابلہ نہ کرسکا اور مجبوراً اِسے بند کرنا پڑا۔ 'الحمراء' کو 2012 میں جاوید یزدانی نے چوتھی مرتبہ نکالا لیکن دو سال بعد اِس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔

مدھیہ پردیش کی اردو صحافت میں جس اخبار نے دھوم مچادی وہ 'آفتابِ جدید' ہے جو سینئر صحافی اشتیاق عارف کی زیرِ ادارت 1978 میں طلوع ہوا، آٹھ ماہ بعد اخباری عملے کی ہڑتال کے نتیجے میں ادارتی ذمے داریاں سید محمود الحسینی کو منتقل ہوگئیں اور صرف ایک ماہ بعد محمود الحسینی کے اچانک انتقال پر غضنفر علی خاں کے نام بظاہر ایڈیٹر کا قرعۂ فال نکالیکن عملاً ادارتی ذمہ داریاں تین ماہ مولانا شرقی خالدی، تین سال مفتی جنید صدیقی اور آخر میں کچھ عرصہ مقصود عمرانی نبھاتے رہے، یہاں تک کہ اگست 1986 میں وسیع سرکولیشن اور اعلا معیار کے باوجود یہ اخبار اُس کے مالک اگروال خاندان کے فیصلے سے اچانک بند ہوگیا کیوں کہ ادارتی عملہ اور مالکان کے درمیان اخبار کی پالیسی کو لے کر اختلاف پیدا ہوگیا تھا، آخر زمانے میں ایک پرانے صحافی اویناش چندر رائے کو اخبار کا ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا لیکن اردو داں ہوتے ہوئے بھی وہ اخبار کی پالیسی پر کنٹرول نہیں کرسکے، اِس اخبار کا دوسرا دور 1987 میں شروع ہوا۔ مقصود عمرانی، دیوی سرن، اقبال مسعود اور ظفر صہبائی نے یکے بعد دیگرے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے لیکن یہ اخبار جس کا ماضی شاندار تھا، دوسرے دور میں پرانا معیار قائم نہیں رکھ سکا اور 1998 میں بند ہوگیا، 'آفتابِ جدید' میں راقم (عارف عزیز)، انعام اللہ لودھی، اقبال مسعود، مسلم سلیم، عمر فاروق ندوی اور خالدہ بلگرامی جیسے تازہ دم صحافی کام کرکے صحافت میں اپنی شناخت قائم کرچکے ہیں۔ اُس زمانے میں اردو اخبارات کی لیتھو پر طباعت کا چلن تھا، لیکن 'آفتابِ جدید' روٹری آفسیٹ پر شائع ہوا اور یو این آئی، پی ٹی آئی کی سروس بھی اُسے دستیاب رہی۔

آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کا چھٹا اور بھوپال کا پانچواں روزنامہ 'بھوپال ٹائمز' 26 جنوری 1988 کو منظرِ عام پر آیا، یہ اخبار اپنی صوری اور معنوی خوبیوں کے باعث یاد رکھا جائے گا۔ مولانا حبیب ریحان ندوی نے اِس کے چیف ایڈیٹر، رضوان خاں نے ایڈیٹر اور راقم (عارف عزیز) نے جوائنٹ ایڈیٹر نیز ایڈیٹوریل نگار کے علاوہ ایڈیٹنگ کے جملہ فرائض انجام دیے، بعد میں یہ بھوپال کے پہلے رنگین ہفت روزہ کی حیثیت سے بھی چھ ماہ 1990 تک نکلتا رہا۔

آزادی کے بعد بھوپال سے نکلنے والا چھٹا اور قابلِ ذکر روزنامہ 'اردو ایکشن' ہے جو 1983 سے ڈاکٹر ماجد حسین کی ادارت میں بطور ہفت روزہ شروع ہوا۔ بارہ سال بعد 1995 میں روزنامہ ہوگیا، اِس میں حامد حسن شاد مرحوم، خلیق صدیقی اور مشاہد سعید نے کام کیا، اخبار کا ضخیم 'بھوپال نمبر' 1996 میں شائع ہوا ہے۔

مذکورہ روزناموں کے علاوہ بھوپال سے 'پرچمِ نو' 1949، 'پیام' 1951، 'حقیقت' 1951، 'خورشید' 1954، 'نیا بھوپال' 1954 بھی شائع ہوئے لیکن 'نیا بھوپال' کو ہی کچھ استحکام ملا جب کہ 'حق و انصاف' 1998، 'یلغار ٹائمز' 2008 'پردیش کی خبریں' 2014 'اخبارِ مشرق' 2015 فی الحال شائع ہورہے ہیں، 'اخبارِ مشرق' 2015 سے بھوپال میں شروع ہوا ہے لیکن اِس کے کلکتہ، دہلی، لکھنؤ سمیت سات ایڈیشن دوسرے شہروں سے نکل رہے ہیں۔

جہاں تک مدھیہ پردیش سے ہفت روزہ اخبارات کا تعلق ہے تو آزادی کے بعد کئی اخبارات نکلے جن میں 'نئی راہ'، 'ترجمان'، 'نیا سماج'، 'راہی'، 'نیا دور'، 'بھوپال پنچ'، 'ایاز'، 'رفتار'، 'الجبل' قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ اخبارات میں 'بھوپال پنچ' 'اودھ پنچ' لکھنؤ کی طرح طنز و مزاح کے لیے مخصوص تھا، اِسے معروف طنز و مزاح نگار عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی نے نکالا اور مقبول بھی ہوا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، تین سال قہقہے اور مسکراہٹیں بکھیر کر 1993 میں بند ہوگیا، دوسرا 'ایاز' عارف بیگ نے 1972 میں شروع کیا، ایمرجنسی کے بعد اشفاق مشہدی ندوی اِسے ایڈٹ کرتے رہے اور 28 سال شائع ہوا، 'رفتار' محفوظ منظر کی اِدارت میں نکلا، 1984 تک جاری رہا، 'الجبل' پہلے جوہر قریشی نے بعد میں محمد ارتضٰی نے نکالا، اِس عرصے میں مدھیہ پردیش کے دوسرے شہروں سے بھی متعدد اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آئے جن میں قابلِ ذکر 'آفتابِ مالوہ' اور 'شعلہ و شبنم' (اُجین)، 'تان سین' (گوالیار)، 'سفیرِ مالوہ'، 'امیرِ احرار' اور 'شاہین' اندور، 'نئے چراغ'، 'بہارستان' اور 'طلسم حرف' (کھنڈوہ)۔ کھنڈوہ کے مذکورہ رسائل میں 'نئے چراغ' 1959 میں مظفر حنفی کی ادارت میں نکلنے والا ایک معیاری ادبی جریدہ تھا۔ 'شجر' اور 'آئینہ' (برہانپور)، 'ادراک' (شیوپوری)، 'گلشن کے پھول' (مہو) کے علاوہ سرونج سے کئی قلمی رسالے اختصار احمد ہاشمی، خالد محمود، مختار شمیم اور شان فخری وغیرہ نے نکالے لیکن یہاں سے شائع ہونے والے سیفی سرونجی کے سہ ماہی 'انتساب' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1983 سے یہ ادبی رسالہ مسلسل شائع ہورہا ہے، اور اِس کے کئی خاص نمبر بہت مقبول ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں بھوپال سے اِس عرصے میں متعدد ادبی رسائل منظرِ عام پر آئے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

پاسبان (لطف اللہ نظمی، جوہر قریشی)، 'آرٹ اینڈ کلچر' اور 'شعلۂ حرف' (ایم عرفان)، 'شہپر' (شاہد اختر)، 'مجلّہ سیفیہ'، (پروفیسر عبدالقوی دسنوی)، 'نوائے سیفیہ' (آفاق حسین صدیقی)، 'آذر' (شفا گوالیاری۔ افسر صہبائی)، 'مزاج' (عیسیٰ صدیقی)، 'تشکیل' (خان باسط)، 'شناخت' (ظفر صہبائی اور اقبال مسعود)، 'فکر و آگہی' (ڈاکٹر رضیہ حامد)، 'صدائے اردو' (نعیم کوثر)، 'تمثیل' (نصرت مہدی۔ اقبال مسعود)، 'کاروانِ ادب' (کوثر صدیقی، جاوید یزدانی) 'اردو ہلچل' (جاوید یزدانی۔ پروفیسر مختار شمیم)۔

بچوں کے رسائل کی اشاعت اوّل و آخر صرف بھوپال سے ہوئی، جن میں 'طفلستان' پہلا بچوں کا رسالہ ہے جو عباس انصاری نے 1947 میں نکالا، بعد میں 'بچوں کا پاکستان' اور 'معصوم دنیا' (گوہر جلالی)، 'بچوں کی دنیا' (جاوید محمود)، 'جگنو' (نعیم کوثر) بھی شائع ہوئے۔ مذہبی رسائل میں دارالعلوم تاج المساجد کا ترجمان پندرہ روزہ 'نشانِ منزل' (1949)، ڈائجسٹ 'جذب و سلوک' (1984)، جامعہ اسلامیہ عربیہ ترجمہ والی مسجد کا ترجمان ماہنامہ 'دینِ مبین' (1985) اور جامعہ حسینیہ خیرالعلوم کا ترجمان 'دعوت خیر' (1999) بھوپال سے شائع ہوئے لیکن 'دین مبین' اور 'دعوتِ خیر' پابندی کے ساتھ شائع ہورہے ہیں۔ دیگر اخبارات و رسائل میں ہفت روزہ 'شاہین کا نشیمن'، 'آبِ حیات'، 'رخسارِ ہند'، 'بابِ ادب'، 'سائبان' بھوپال سے اور 'عالمی زبان' سرونج سے نکل رہے ہیں۔

مدھیہ پردیش کی اردو صحافت (آغاز سے 2016 تک) کے اِس 167 سالہ اجمالی جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست میں اردو صحافت کا مرکز ابتدا سے بھوپال رہا ہے، جہاں سے آج بھی چھ اردو روزنامے، ایک سہ ماہی، ایک پندرہ روزہ اور نئے پرانے آٹھ ہفت روزہ اخبارات و رسائل منظرِ عام پر آرہے ہیں۔

---

**عارف عزیز**
20-گھاٹی بھڑ بھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت:300روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت:500روپے

# اردو دُنیا

## میونسپل سکریٹری آفس میں

## اُردو مترجمین کی تعداد بڑھائی جائے: کرن بالا

نئی دہلی (3 ستمبر)۔ دہلی میونسپل کارپوریشن کے ہیڈکوارٹر سِوِک سنٹر میں میونسپل سکریٹری آفس میں ایک اردو شعبہ ہے جس میں اردو مترجمین ہاؤس کے ایجنڈے اور کارروائی کی روداد تیار کرتے ہیں۔ اردو شعبے میں دو مترجم تھے، جن میں سے ایک عرفان الحق گذشتہ دنوں ریٹائر ہوگئے ہیں۔ اب یہاں صرف آفاق حسین اردو کے واحد مترجم رہ گئے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں اردو مترجمین کی تعداد 7 ہوا کرتی تھی جسے بعد میں پانچ اور ایم سی ڈی کے انضمام کے بعد دو کردیا گیا۔ ہاؤس کا ایجنڈا اور کارروائی کی روداد ہندی، انگریزی، اردو اور پنجابی زبانوں میں کونسلروں کو دی جاتی ہے۔ ایم سی ڈی ایکٹ میں ایسا کہیں نہیں لکھا کہ کوئی کونسلر کسی ایک زبان میں ہی ایجنڈا اور کارروائی کی روداد حاصل کرے گا، ہر کونسلر ہر ایک زبان میں ایجنڈے اور روداد کی کاپیاں حاصل کرسکتا ہے لیکن پچھلے کچھ دنوں سے سکریٹری آفس نے ہر ایک کونسلر کو صرف ایک زبان میں ایجنڈے اور روداد کی کاپیاں لینے کی شرط لگا دی ہے جوکہ ایکٹ کی خلاف ورزی ہے۔ سابق میونسپل سکریٹری بھگوان سنگھ نے عام آدمی پارٹی کے دور میں اردو مترجمین کی تعداد پانچ سے گھٹا کر دو کردی تھی، جس پر کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ اب جب کہ اردو شعبے میں اردو کا صرف ایک مترجم رہ گیا ہے، اس بات کو بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھانے کی ضرورت ہے کہ اردو شعبے میں اردو مترجمین کا تقرر کیا جائے اور پہلے میونسپل سکریٹری کے ذریعے اسامیوں کو بڑھایا جائے۔ ایم سی ڈی میں مختلف وارڈوں سے کئی مسلم کونسلر ہیں لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ میونسپل سکریٹری آفس میں اردو مترجمین کی تقرری کی وکالت کرے۔ اردو زبان جو خالص ہندستانی زبان ہے اور جسے دہلی میں دوسری سرکاری زبان ہونے کا بھی درجہ حاصل ہے۔ اردو کی زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اردو والے ہی اس کی بقا کے لیے کھڑے ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ ہندستان کی زبان ہے، اس کی مثال اس بات سے دی جاسکتی ہے کہ میونسپل کارپوریشن میں اس کے لیے ایک غیر مسلم کونسلر نے پہلی آواز اٹھائی ہے۔ دہلی گیٹ وارڈ کی کونسلر کرن بالا نے ایم سی ڈی میئر راجا اقبال، کمشنر اشونی کمار اور میونسپل سکریٹری شیوا پرساد کو مکتوب ارسال کرکے اردو شعبے میں پہلے کی طرح اردو مترجمین کی تعداد 7 کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ہندی، انگریزی اور پنجابی زبان میں ایجنڈا تیار ہوتا ہے اسی طرح اردو میں بھی تیار ہوتا رہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو شعبے میں مترجمین کی تعداد بڑھائی جائے، وہاں تقرریاں کی جائیں تاکہ اردو شعبہ پوری صلاحیت کے ساتھ کام کرسکے اور کونسلروں کو اردو میں بھی ایجنڈے کی کاپی مل سکے۔ اسٹینڈنگ کمیٹی کی رکن رافعہ ماہر نے کہا کہ ایم سی ڈی سے پوری تفصیلات لے کر میں اس سلسلے میں آگے کی کارروائی کروں گی۔ (انقلاب۔ دہلی)

## پٹنہ ضلع کے اُردو ملازمین کی میٹنگ میں فروغِ اُردو پر غور و خوض

پٹنہ (10 ستمبر)۔ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومتِ بہار کی حسبِ ہدایت اور ضلع اردو زبان سیل، پٹنہ کلکٹریٹ کے زیرِ اہتمام پٹنہ کلکٹریٹ کے کانفرنس ہال میں پٹنہ ضلع کے سبھی سب ڈویژن، بلاک اور سرکل آفسوں میں مامور اردو ملازمین کی ماہانہ نشست منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے اردو مترجم بشمول انچارج آفیسر ضلع اردو زبان سیل جناب شہباز احمد نے کہا کہ ہمارا اولین فریضہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے فروغ کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہنا ہے۔ ساتھ ہی میٹنگ میں پیش کی گئی مختلف دفاتر کی ماہانہ ترقیاتی رپورٹ کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومتِ بہار نے اردو کے فروغ اور اردو آبادی کی سہولت کے لیے ہر دفتر میں اردو ملازمین بحال کر رکھا ہے، لیکن اردو والے خود اردو میں اپنی درخواستیں نہیں دیتے ہیں۔ انھوں نے اردو آبادی سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ آپ دفاتر میں اپنی شکایتیں اور درخواستیں اردو زبان ہی میں جمع کریں، اس سے جہاں زبان کی ترقی ہوگی وہیں آپ کے مطالبات بھی جلد حل کیے جائیں گے۔ میٹنگ میں ماہِ اگست کے اندر سبکدوش ہونے والے محرر جناب طاہر رضا کے لیے ایک الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر جہاں طاہر رضا صاحب نے جذباتی انداز میں اپنے 34 سالہ مدتِ ملازمت کے تجربات پیش کیے وہیں دیگر اردو ملازمین نے بھی ان کے تئیں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اپنے جذباتی الوداعی خطاب میں جناب طاہر رضا نے کہا کہ پہلے نہ تو اردو ملازمین کو اتنے وسائل مہیا تھے جتنے آج ہیں اور نہ ہی اتنی تعداد میں بحالیاں ہوتی تھیں۔ آج ریاستِ بہار کے ہر سرکاری دفتر میں اردو ملازم بحال ہیں، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اردو آبادی زبان کے تئیں حساس و بیدار نہیں ہے۔ اس موقعے پر ضلع اردو زبان سیل کے منظور عالم اور شاہد وصی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بلاک ترقیاتی دفتر بختیار پور کے شمیم احمد نے اپنی نظموں اور گیتوں سے سماں باندھ دیا۔ آخر میں انچارج آفیسر ضلع اردو زبان سیل کے کلماتِ تشکر کے ساتھ میٹنگ اختتام کو پہنچی۔ میٹنگ میں پٹنہ ضلع کے سبھی سب ڈویژن، بلاک اور سرکل آفسوں کے اردو ملازمین شریک رہے۔ (قومی تنظیم۔ پٹنہ)

## اقلیتی اقامتی اسکولوں اور جونیر کالجوں میں بہتر تعلیم اور انفراسٹرکچر پر حکومتِ تلنگانہ کی توجہ

حیدرآباد (2 ستمبر)۔ وزیر اقلیتی بہبود اے. لکشمن کمار نے آج ناملی کے علاقے میں اقلیتی اقامتی اسکول سوسائٹی کے جونیر کالج آصف نگر بوائز ا کی نئی عمارت کا افتتاح انجام دیا۔ اس موقعے پر مقامی رکنِ اسمبلی ماجد حسین اور صدر تلنگانہ اقامتی اسکول سوسائٹی محمد فہیم الدین قریشی، کلکٹر حیدرآباد محترمہ ہری چندنا اور سکریٹری اقلیتی بہبود و سکریٹری اقامتی اسکول سوسائٹی بی شفیع اللہ موجود تھے۔ نئی عمارت کے تحت دو علاحدہ بلاکس 8.5 کروڑ کے صرفے سے تعمیر کیے گئے ہیں جن میں ایک جونیر کالج اور دوسرا ہاسٹل کی عمارت ہے۔ ریاستی وزیر اور دیگر مہمانوں کی آمد پر طلبہ کی جانب سے روایتی انداز میں استقبال کیا گیا۔ تلنگانہ حکومت نے اقامتی اسکولوں اور جونیر کالجوں کے لیے ذاتی عمارتوں کی تعمیر کا فیصلہ کیا ہے اور ناملی کے علاقے میں آصف نگر بوائز ا کے لیے شاندار عمارت تعمیر کی گئی۔ اس موقعے پر میڈیا کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے وزیر برائے اقلیتی بہبود اے. لکشمن نے کہا کہ وزیرِ اعلا ریونت ریڈی نے اقامتی اسکولوں اور جونیر کالجوں میں طلبہ کو معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ بہتر انفراسٹرکچر کی فراہمی کی ہدایت دی ہے۔ آصف نگر بوائز ا کی عمارت 8.5 کروڑ سے تعمیر کی گئی ہے جس میں تمام تر سہولتیں موجود ہیں۔ وزیر اقلیتی بہبود نے مزید کہا کہ حکومت اقامتی اسکولوں میں درکار ضرورتوں کی تکمیل کے لیے تیار ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں اور کالجوں کے سلسلے میں اُن سے جو بھی نمائندگی کی جائے گی وہ بجٹ منظور کریں گے۔ صدر اقامتی اسکول سوسائٹی محمد فہیم الدین قریشی نے کہا کہ تلنگانہ حکومت نے انٹیگریٹڈ اقامتی اسکولوں کے کمپلیکس کی تعمیر کا آغاز کیا ہے جس کے تحت 25 ایکڑ اراضی پر 200 کروڑ کے صرفے سے عصری سہولتوں سے مزیّن کمپلیکس تعمیر کیا جائے گا جس میں ایس سی، ایس ٹی، بی سی اور اقلیتی اقامتی اسکولوں کی گنجائش رہے گی۔ سکریٹری اقامتی اسکول سوسائٹی بی شفیع اللہ نے کہا کہ اقامتی اسکولوں اور جونیر کالجوں میں طلبہ کا تعلیمی مظاہرہ شاندار رہا ہے۔ مسابقتی امتحانات میں اقامتی جونیر کالجوں کے طلبہ نے اپنی قابلیت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقامتی اسکولوں اور جونیر کالجوں کو بہت جلد ذاتی عمارتوں میں منتقل کردیا جائے گا۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

## اردو اکادمی دہلی کے روایتی مشاعرے دہلی حکومت کی عدمِ توجہی کے شکار

نئی دہلی (6 ستمبر)۔ اردو اکادمی دہلی سال میں دو بڑے مشاعرے کراتی ہے۔ ان دونوں مشاعروں کا اہتمام قومی تہوار یعنی یومِ جمہوریہ اور یومِ آزادی کے جشن کے طور پر کیا جاتا ہے، لیکن امسال اگست میں اردو اکادمی دہلی کی جانب سے جشنِ آزادی کا مشاعرہ منعقد نہیں کیا گیا۔ اس حوالے سے اردو اکادمی دہلی کے دو سینئر افسران نے الگ الگ وجوہ بیان کیں۔ ایک نے کہا کہ اگست ختم شدہ، جب کہ دوسرے نے کہا کہ اردو اکادمی ہی کیا کسی بھی اکادمی کو اس بار مشاعرے کی اجازت نہیں ملی، یعنی ہندی اور پنجابی اکادمیوں نے بھی جشنِ آزادی کے موقعے پر کوی سمّیلن نہیں کیا۔ سینئر افسران نے کہا کہ دوسری زبانوں کی اکادمیوں کی طرح ہماری طرف سے فائل بھیجی گئی تھی لیکن اگست میں کسی کو بھی منظوری نہیں ملی۔ اب چوں کہ اگست ختم ہوچکا ہے، اس لیے مشاعرے کے انعقاد کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انجمن تعمیرِ اُردو کے نائب صدر شیخ علیم الدین اسعدی نے کہا کہ دہلی میں حکومت چاہے جس پارٹی کی رہی ہو، اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام جشنِ جمہوریہ اور جشنِ آزادی کے مشاعرے ہوتے آئے ہیں۔ یہ روایتی مشاعرے ہیں جن کا اردو والوں اور شاعروں کو انتظار رہتا ہے۔ حکومت ان روایتی مشاعروں کی اجازت نہ دے کر اس روایت کو ختم کرنا چاہتی ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔ حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ جلد از جلد روایتی انداز میں جشنِ آزادی کے مشاعرے کا اہتمام کرے۔ دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن کے نائب صدر محمد تقی نے کہا کہ مشاعرے اردو کے فروغ کا بڑا ذریعہ ہیں جن میں غیر اردو والے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام جشنِ آزادی کا مشاعرہ نہ ہونا مایوس کن بات ہے۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے صدر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی سرکاری ادارہ ہے، مشاعرے کی اجازت نہ دینا حکومت کی اردو کے تئیں عدمِ دل چسپی کی علامت ہے۔ جشنِ آزادی کا روایتی مشاعرہ نہ ہونا افسوسناک ہے، اگر یہی طرزِ عمل رہا تو روایتی مشاعرے ختم ہوجائیں گے۔ (انقلاب۔ دہلی)

کچھ اُداس نظمیں
ہربنس مکھیا
قیمت: 300 روپے

# ایم. جبیب خاں اردو زبان و ادب کے سچے خادم تھے: **پروفیسر اختر الواسع**

علی گڑھ (26 اگست)۔ ایم. جبیب خاں بنیادی طور پر اردو کے شیدائی اور عاشقِ صادق تھے۔ ان سے میرا رشتہ بہت قدیم ہے، وہ زبان و ادب کے سچے خادم تھے اور تاعمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کیا، وہ آج خیابانِ ادب علی گڑھ میں ایک مذاکرہ بعنوان 'ایم. جبیب خاں کی حیات و خدمات' سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابنِ فرید اور ایم. جبیب خاں کے احسانات سے میں سر نہیں اٹھا سکتا۔ ابنِ فرید کی ادارت میں شائع ہونے والے 'ادیب' کے شمارے بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور جبیب صاحب کی لکھی ہوئی کتابیں جس میں انھوں نے میر سے لے کر غالب تک، حسرت سے لے کر فراق تک کے ساتھ جو دیگر کام کیے اس سے نہ صرف ہم نے بلکہ اس دور کے سیکڑوں لوگوں نے فائدہ اٹھایا، اس لیے امتحان دینے اور کامیاب ہونے میں ان کا اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سرسیّد نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج کی بنیاد نہیں رکھی تھی اس کا مقصد صرف تعلیم نہیں تھا بلکہ تعلیم و تربیت اور تہذیب تینوں کی یکجائی سرسیّد کو مقصود تھی اور انھوں نے اسی کا اہتمام کیا تھا۔ سرسیّد نے کہا تھا کہ قرآن خدا کا قول ہے اور کائنات خدا کا فعل ہے اور خدا کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ خیابانِ ادب کے بانی پروفیسر صغیر افراہیم نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ایم. جبیب خاں اردو ادب کی ایسی ہستی ہیں جنھوں نے اردو ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) سے ایک عرصۂ دراز تک بحیثیت اسسٹنٹ سکریٹری منسلک رہے اور متعدد مضامین اور کتابیں ترتیب دیں، جن میں افکارِ میر، ولی سے آتش تک، ہمارے دور کے افسانے، حسرت سے فراق تک، غالب سے اقبال تک، دیوانِ عرش وغیرہ اہم ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سیما ادبی مجلّہ کے اگلے شمارے میں ان کا گوشہ نکالا جائے تاکہ ان کے کام کی زیادہ سے زیادہ پذیرائی ہو سکے۔ اس موقعے پر ایم. حبیب خاں کے فرزند ایم. خورشید خاں نے کہا کہ میرے والد ایم. جبیب خاں علی گڑھ اور اردو کے سچے عاشق تھے۔ انھوں نے اردو کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی پذیرائی کرنا اور سیما ادبی مجلّہ میں ان کو جگہ دینا ایک اچھا قدم ہے، اس کے لیے میں پروفیسر صغیر افراہیم کا شکر گزار ہوں۔ پروفیسر جمشید قمر نے کہا کہ ہم نے طالبِ علمی کے زمانے میں ایم. جبیب خاں کی مرتّب کردہ کتابوں سے خوب استفادہ کیا ہے جس کے نتیجے میں ہمارا ادبی ذوق پروان چڑھا۔ پروفیسر طارق چھتاری نے کہا کہ ایم. جبیب خاں کی کتابیں اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس سلسلے میں ان پر زیادہ سے زیادہ مضامین تحریر کرنا چاہیے۔ پروفیسر عبدالودود قاسمی نے کہا کہ ایم. جبیب خاں غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں کے ذریعے طلبہ کی ذہن سازی کی اور ہم نے بھی ان کی کتابوں کے مطالعے کی روشنی میں اپنے ادبی افکار کو مزین کیا ہے۔ آخر میں پروفیسر عبدالعلیم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ایم. جبیب خاں اردو ادب کے ایک ایسے خدمت گزار تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس موقعے پر آصف اظہار، ڈاکٹر عرفان جمالی اور ڈاکٹر سیّد بصیر الحسن وفا نقوی نے غزلیں پیش کیں۔ پروگرام میں شامل ہونے والوں میں سیّد مسعود حسن، انجینئر اظہار الدین، زبیر خورشید، ڈاکٹر شہاب شبیر، نور جہاں بیگم (رانچی)، سیف علی قمر، محمد ثمر، محمد افضل اور انعم فاطمہ و دیگر کے نام شامل ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

# مہنار کے سبھی سرکاری دفاتر پر اردو میں بھی نیم پلیٹ آویزاں کرنے کا مطالبہ

حاجی پور (28 اگست)۔ تنظیم برائے اقلیتی فلاح مہنار، ویشالی کے صدر ایاز احمد خاں نے وزیرِ اعلا نتیش کمار کو ایک عرض داشت بھیج کر مہنار سب ڈویژن کے سبھی سرکاری دفاتر کے بورڈ اور نیم پلیٹس ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی درج کرانے کی مانگ کی ہے۔ ایاز احمد خاں نے وزیرِ اعلا کے نام لکھی درخواست میں ذکر کیا ہے کہ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اور حکومتِ بہار اس کی ترقی و ترویج کے لیے کافی سنجیدہ بھی ہے مگر افسران کی تساہلی اور سست روی کے سبب کسی بھی پروگرام، فلاحی منصوبوں، سنگِ بنیاد، افتتاح اور دعوت نامے میں اردو کو جگہ نہیں دی جاتی ہے جب کہ اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ کے ڈائرکٹر کے ذریعے بارہا ڈی ایم، ایس ڈی او سمیت دیگر افسران کو ہدایت دی جاتی رہی ہے کہ سبھی سرکاری تقریبات سے لے کر منصوبوں کی سنگِ بنیاد، افتتاح اور چوک چوراہے، سرکاری عمارات پر لگے سائن بورڈوں میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی جگہ دی جائے مگر ضلع سے لے کر سب ڈویژن تک اردو ڈائرکٹوریٹ بہار پٹنہ کی ہدایت کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا ہے۔ ایاز احمد خاں نے لکھا ہے کہ اس وقت نگر پریشد مہنار ویشالی کے ذریعے شہر کے چوک چوراہے اور منصوبوں کے نام کے سائن بورڈ لگ رہے ہیں، مگر ان سائن بورڈوں میں جان بوجھ کر اردو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ (قومی تنظیم۔ پٹنہ)

# ہم زمین بانٹ سکتے ہیں ہوا کو تقسیم نہیں کر سکتے: پروفیسر محمد زماں آزردہ

## غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام بہ اشتراک گرونانک دیو یونی ورسٹی 'غالب اور پنجاب' کے موضوع پر دوروزہ قومی سمینار منعقد

نئی دہلی (3 ستمبر، پریس ریلیز)۔ غالب مشرقی دانش کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کے بعد ہر فنکار نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ ہم زمین کا بٹوارہ تو کر سکتے ہیں لیکن ہواؤں کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر محمد زماں آزردہ نے 'غالب اور پنجاب' کے موضوع پر منعقد دوروزہ قومی سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام بہ اشتراک گرونانک دیو یونی ورسٹی، امرتسر یہ سمینار امرتسر یونی ورسٹی کے گرونانک بھون میں منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر آزردہ نے مزید کہا غالب کے سلسلے میں نئی بات کہنا اس لیے مشکل ہے کہ غالب اب کتابوں میں نہیں ذہنوں میں زندہ ہیں۔ ان کا پنجاب سے تعلق تو اس واقعے سے واضح ہے کہ جب مہاراجا پٹیالہ نے انگریزوں کی کمک کے لیے فوج بھیجی تو اسے ہدایت دی کہ محلّہ بلی ماران پر کسی قسم کی سختی نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ وہاں غالب کا گھر ہے۔ اقبال نے ان کو جس طرح خراجِ عقیدت پیش کی ہے اس کی الگ تفصیل ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت اڈیشنل ڈی جی پی، پنجاب، جناب فیاض فاروقی نے کی۔ صدارتی خطبے میں انھوں نے کہا غالب نے سوچ سمجھ کے اپنا تخلص 'غالب' رکھا تھا، کیوں کہ وہ حقیقت میں سب پر غالب آئے۔ میں جب اس مصرع کے بارے میں سوچتا ہوں 'بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے' تو حیران رہ جاتا ہوں کہ غالب نے کس سطح پر جا کر سوچا ہوگا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ اور گرونانک دیو یونی ورسٹی کے ذمے داران مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اتنے اہم موضوع کو گفتگو کا مرکز بنایا۔ ایچ ایس ای سی ہماچل پردیش کے چیئرمین پروفیسر سربجوت سنگھ بہل نے کہا غالب کو پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ اس بہانے بہت سے موضوعات زیرِ مطالعہ آ جاتے ہیں، جیسا کہ آج کے سمینار سے ظاہر ہے۔ غالب نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسے انداز کو متعارف کرایا جس میں غور و فکر پیش پیش ہے۔ یہ ایسا انداز نہیں جو سنتے ہی دل میں اتر جائے اس کو سمجھنے کے لیے بار بار غور کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بطورِ مہمانِ خصوصی اس اجلاس میں شرکت کی۔ انھوں نے کہا پچھلے دنوں میں نے غالب پر تین کتابوں کا مطالعہ کیا، اس طرح غالب کے ساتھ کچھ چلنے کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ تخلیقی سطح پر بھی فنکار غالب کو ایک علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ فنکار تو اور بھی ہیں لیکن ان کی شخصیت ہمارے مسائل کا ساتھ دیتی ہے۔ مہمانِ ذی وقار جناب سدرشن کپور نے کہا غالب پریکٹیکل لائف میں ہمارا بہت ساتھ دیتے ہیں۔ میں پیشے سے وکیل ہوں، کورٹ میں جب اپنی دلیل پیش کرتا ہوں تو فریقِ مخالف کا وکیل اس پر نکتہ چینی کرتا ہے اور میرے ذہن میں مصرع گردش کرتا ہے 'نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے'، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا غالب سے کتنا گہرا ذہنی رشتہ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو بار دہلی سے باہر غالب سمینار کا انعقاد کرتا ہے اس سلسلے میں ہندستان کے مختلف شہروں میں سمینار کا انعقاد ہو چکا ہے لیکن میری دیرینہ خواہش تھی کہ پنجاب میں بھی غالب سمینار کا انعقاد ہو اور آج اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھنا

...(بقیہ صفحہ 6 ر)

# رفتید ولے نہ از دلِ ما

## جیلانی خان

پٹنہ۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی اور روزنامہ 'انقلاب' (لکھنؤ) کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر جیلانی خان علیگ کا 5 ستمبر 2025 کی صبح یہاں ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ وہ تقریباً 51 برس کے تھے۔ وہ گذشتہ دو برسوں سے گردے کے عارضے میں مبتلا تھے اور ڈائلیسس پر تھے۔ ذیابیطس سمیت مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کے باوجود جیلانی خان علیگ کا حوصلہ بلند تھا اور پابندی سے اپنے کام انجام دے رہے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ مرحوم جیلانی خان کی نمازِ جنازہ ان کے آبائی گاؤں اورنگ آباد ضلع کے بن تارا میں 6 ستمبر کو ادا کی گئی اور گاؤں میں ہی واقع قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

جیلانی خان کی پیدائش 4 مئی 1947 کو ہوئی تھی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے معاشیات میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کرنے کے بعد ماس کمیونی کیشن میں ایم اے کیا اور انگریزی صحافت سے ابتدا کرتے ہوئے پندرہ روزہ 'ملّی گزٹ' سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد 2003 میں 'عالمی سہارا' کی اشاعت سے منسلک ہو گئے۔ جب روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کی اشاعت حیدرآباد سے شروع ہوئی تو انھیں اس کا انچارج بنا کر بھیجا گیا۔ 'راشٹریہ سہارا' سے علاحدگی کے بعد ایک انگریزی ویب سائٹ کے لیے کام کرنے لگے مگر جیسے ہی 2016 میں انھیں موقع ملا تو لکھنؤ کے 'انقلاب' کی اشاعت میں انھوں نے 23 جولائی کو بطورِ بیورو چیف شمولیت اختیار کر لی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد انھیں لکھنؤ کی تمام اشاعتوں کا ریزیڈنٹ ایڈیٹر بنا دیا گیا جہاں وہ بڑی تندہی اور پابندی سے تمام امور انجام دیتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

# نئی کتابیں

## تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : کچھ اداس نظمیں
مصنف : پروفیسر ہربنس مکھیا
اشاعت : 2024
ضخامت : 108 صفحات
قیمت : 300 روپے
ملنے کا پتا : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، 212، راؤز ایونیو
نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : پروفیسر سرورالہدیٰ

E-mail: sarwar103@gmail.com

ہربنس مکھیا نے اپنی نظموں کو اداس نظمیں کہا ہے اور پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت کی ہے: ''سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایک طویل عمر گزار دی بغیر کسی بہت بڑے دکھ یا غم کا سامنا کیے''۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ اداسی کہاں سے آئی۔ شاعری ان کے نزدیک سوانح نہیں ہے اسی لیے وہ زور دیتے ہیں کہ ان نظموں میں جو اداسی ہے وہ شخصی طور پر ان کی نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی کہ نظموں کی اداسی میری اداسی نہیں۔ یہ بات ہربنس مکھیا سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ اداسی کسی کی ذات میں کبھی اتنی خاموشی کے ساتھ آجاتی ہے کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اداسی چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ یہ فرق کرنا بہت مشکل ہے کہ شخصی اداسی کب تاریخی اداسی بن جاتی ہے اور کب تاریخی اداسی شخصی اداسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہربنس مکھیا ایک تاریخ دان کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں خصوصاً عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے سلسلے میں۔ تاریخ نویسی کے ایک لمبے سلسلے اور سفر کے بعد تاریخ اور وقت کو نظموں کے وسیلے سے سمجھنے کی کوشش، تاریخ کو خیال کی ایک خاص سطح تک لے جا کر دیکھنا ہے۔ تاریخ کا خیال سے کیا رشتہ ہے، اس سوال کا جواب تاریخ نویسی کے قدیم اور جدید اصولوں سے مل سکتا ہے۔ ہربنس مکھیا کی نظموں میں تاریخ کئی طرف سے اپنی موجودگی درج کراتی ہے۔ ایک تاریخ وہ ہے جس کے دھارے پر پوری انسانی آبادی ہے، اور ایک وہ تاریخ ہے جس کا رشتہ فردِ واحد کے دکھ سکھ سے ہے۔ دونوں تاریخیں ہربنس مکھیا کے یہاں کہیں کہیں مل گئی ہیں مگر زیادہ تر صورتوں میں یہ الگ الگ طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

تاریخ کو موضوع بنانے کی روایت اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ مگر تاریخ ہر حساس شخص کو اپنے طور پر متاثر بھی کرتی ہے اور پریشان بھی۔ ایک وقت ہے جو کبھی اتنا شور مچاتا ہے کہ پھر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ماضی وقت کا کوئی ٹھہرا ہوا علاقہ تو نہیں۔ اسی لیے ہربنس مکھیا کے یہاں ماضی کا حوالہ صرف گزرے ہوئے وقت کا حوالہ نہیں رہ جاتا۔ وقت کی صورتیں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں ایک ہی وقت میں ایک طرح سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ تاریخ نویس کا تاریخ کو نزدیک اور دور سے دیکھنے کی خواہش کوئی خوشگوار عمل نہیں ہے، اسی لیے ہربنس مکھیا کی 'کچھ اداس نظمیں' اختصار کے ساتھ کہیں کہیں تاریخ میں بہت دور تک سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن وقت ہے کہ ان کی نظموں میں اپنی فتح کا اعلان کرتا ہے۔ پھر بھی ایک مورخ زندگی اور کائنات کو نئی نظر سے دیکھتے ہوئے امید کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتا۔ مگر کیا کیا جائے کہ امید سر جھکائے وقت کے فیصلے کا انتظار کرتی ہے۔ یہی وہ احساس ہے جو مکھیا کی نظموں میں بار بار سر اٹھاتا ہے۔ ہربنس مکھیا کی ایک نظم 'ہمارا ماضی' ہے جس میں ماضی کو ایک پرچھائیں کی صورت میں دیکھا گیا ہے جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ ماضی کو دفن کر کے حال کی طرف قدم بڑھانا یا حال کا ہو جانا کتنا دشوار ہے۔ ہربنس مکھیا نے 'تاریخ' کے عنوان سے ایک نظم میں ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا ہے جس کا رشتہ ہمارے زمانے کی نئی تاریخ نویسی سے بہت گہرا ہے، مگر فرق کتنا ہے۔ کہتے ہیں:

> ہم نے کتنی ہی بار/ تاریخ کو ازسرِ نو لکھنے کا ارادہ کیا/ ہم
> تاریخ کو گھوڑا بنا کر اس پر سوار ہوئے/ جس کی سمت اور
> رفتار/ ہمارے عزم کی محتاج تھے/ کبھی ہم نے اس گھوڑے کو
> محض ایک تصور سمجھا/ جس کے جسم کی قوت اور پیروں کی
> تعداد/ فقط ہمارے ذہن کی ایجاد تھی/ پھر کبھی یہ گھوڑا پتھر بن
> گیا/ جس کے پیروں کے نیچے پہیے لگے تھے/ اس کی سمت
> اور رفتار پر/ کسی کا کوئی قابو نہیں تھا/ کبھی ہم نے تلوار اٹھا
> کر/ اور کبھی اصولوں کا جال بن کر/ تاریخ پر اختیار
> بٹھایا/ آج لگتا ہے دراصل/ ہم تاریخ کے روبرو کتنے ناچار
> ہیں/ گویا اس نے ہم سے ہمیشہ آنکھ مچولی کھیلی ہو/

ہربنس مکھیا تاریخ کو ٹکڑوں میں نہیں دیکھتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخ کا کوئی لمحہ ان کے خیال کی رو کو کسی مخصوص سمت میں فعال کر دیتا ہے اور پھر وہ لمحہ اپنے شخصی اور تاریخی سیاق کے ساتھ کچھ ٹھہر سا جاتا ہے۔ تاریخ سے کس کو کیا ملا ہے اس پر ناز کرنے کا مطلب تاریخ کو مختلف حوالوں سے دیکھنا ہے۔ ان کی ایک نظم 'وہ لمحہ' تاریخ کے کسی خاص موڑ کا پتا دیتا ہے جو بظاہر شخصی ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم 'جرم' بھی ہے۔ گویا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وقت کی گرفت سے ہم آزاد ہیں مگر پھر وقت ہمیں اپنی عدالت میں لے آتا ہے۔ ہربنس مکھیا کے لیے وقت صرف ماضی نہیں بلکہ حال ہے جو اپنے کٹے پھٹے چہرے کے ساتھ اخبار کی سرخیوں میں دکھائی دیتا ہے اور پلاسٹک کے تھیلوں کی تعداد میں بھی اور مزدوری کرنے والے بچوں کی تصویروں میں بھی۔ کیسی بے بسی ایک مورخ کی ہے کہ وہ اپنی پریشانی میں ہی ان مسائل کا حل ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک نظم 'وقت' ہے، مگر یہ وہ وقت ہے جو کسی باغی اور عاشق کا ہے جس میں انکار کی قوت رہی ہے۔ ہربنس مکھیا کی ایک نظم 'مہاجر' ہے جس میں مبارک علی ٹونک راجستھان سے اپنے ہاتھوں میں بارش کا پانی لے کر کراچی کی ٹرین میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان دنوں سیلاب اور برسات نے جو صورتِ حال پیدا کی ہے، اس میں یہ نظم کتنی مختلف تاثر کی حامل ہے:

> ''اس روز بہت بارش ہوئی تھی/ وہ ساری بارش/ مبارک
> علی/ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں/ سمیٹ کر/ اپنے
> ساتھ لے گئے/ انھیں لگا جیسے کہیں اور کا پانی اتنا میٹھا نہ
> ہوگا/ عرصہ گزرا/ مبارک علی کا گھر پھولا پھلا/ وہ خود باپ
> بنے/ لیکن پانی ابھی بھی وہی پیتے/ جو اپنے ہاتھوں میں
> سمیٹ لائے تھے/ پھر ایک دن/ وہ پانی ختم ہونے کو آیا/ تو
> مبارک علی واپس ٹونک آئے/ پر اس بار/ وہاں کی گلیوں
> میں انھیں/ کڑی دھوپ ملی/ دھوپ اور سوکھا/ اس بار ٹونک
> میں بارش نہیں ہوئی تھی''۔

'کچھ اداس نظمیں' انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مجموعے کا 'تعارف' لکھا ہے۔ اِس کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر اطہر فاروقی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

◆◆◆

# ہم زمین بانٹ سکتے ہیں ہوا کو تقسیم نہیں کر سکتے

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

بہت حوصلہ افزا ہے۔ اس موقعے پر دیوانِ غالب (پنجابی) کی رسمِ رونمائی بھی عمل میں آئی۔ پروفیسر منجندر سنگھ (صدر شعبۂ اردو و فارسی گرونانک دیو یونی ورسٹی) نے کہا میں جن شاعروں سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں ان میں غالب کا نام سرِ فہرست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی فکر سے وہ بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کو ایسے دوست کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی غم خواری کرے نہ کہ مشکل وقت میں نصیحت کرنے بیٹھ جائے۔ اسی شعبے کے استاد ڈاکٹر ریحان حسن نے کہا اردو میں جو بھی شاعر زندہ ہیں وہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کے سبب ہیں لیکن تنہا غالب ہیں جو صرف اپنی غزل گوئی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ وہ ہمارے دکھ درد سے بہت واقف ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے بعد کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب فیاض فاروقی اور محمد زماں آزردہ نے کی اور نظامت کے فرائض جناب شمس تبریزی نے انجام دیے۔

مشاعرے میں پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر سربجوت سنگھ بہل، ڈاکٹر منموہن سنگھ، پروفیسر عزیز عباس، جناب شمس تبریزی، پروفیسر روبینہ شبنم، ڈاکٹر پردیپ مہاجن کنول، ڈاکٹر محمد ایوب خان، ڈاکٹر جتندر پرواز، جناب شبیر حسین، جناب دیو ہندوی اور جناب ضمیر علی ضمیر نے اپنے کلام پیش کیے۔ 4 ستمبر کو سمینار کے دو ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ جس طرح ہم دیوار کے پار نہیں دیکھ سکتے لیکن ایک مشین دیکھ سکتی ہے اور دوسری مشین اس سے زیادہ باریک چیز کو دیکھ سکتی ہے، اسی طرح ہر انسان کی نظر برابر نہیں ہوتی کچھ معمولی سطح تک سوچ سکتے ہیں۔ غالب کی اہمیت اسی لیے مسلم ہے کہ وہ جس سطح سے چیزوں کو دریافت کرتے ہیں وہ عام طور پر نظر نہیں آتی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر عزیز عباس، پروفیسر روبینہ شبنم، پروفیسر محمد جمیل، جناب شمس تبریزی اور محترمہ شاہین اختر نے مقالات پیش کیے اور ڈاکٹر محضر رضا نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر منجندر سنگھ اور ڈاکٹر پردیپ مہاجن کنول نے فرمائی۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا غالب کا رشتہ صرف اردو یا کسی خاص سرزمین تک محدود نہیں ہندستان کی تمام زبانوں پر بلکہ ہندستان سے باہر بھی غالب کی شاعری کو جس قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ پنجاب سے بھی ان کا تعلق کوئی نئی بات نہیں ان کے زمانے میں بھی وہ لوگ موجود تھے جن سے غالب کی خط و کتابت تھی اور اس زمانے سے آج تک اس سرزمین کا رشتہ غالب سے بہت گہرا ہے۔ پروفیسر منجندر سنگھ نے کہا کہ غالب اور پنجاب ایک تفصیلی موضوع ہے، اس موضوع پر تفصیل سے منصوبہ بند طریقے سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ سمینار ایک موقع فراہم کرتا ہے کہ بہت سارے تشنہ پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا جائے اور ایک تحقیقی مکالمہ قائم ہو۔ ڈاکٹر پردیپ مہاجن کنول نے کہا کہ غالب اور پنجاب دونوں ہی ایسے سلسلے ہیں جن سے ہمارا جذباتی اور تہذیبی رشتہ بہت مضبوط ہے۔ تنقید و تحقیق کے علاوہ تخلیقی میدان میں غالب کا اثر اس خطے پر آج تک واضح ہے۔ سینئر وکیل جناب سدرشن کپور نے اس اجلاس میں بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اور گرونانک دیو یونی ورسٹی نے ایک اہم موضوع کی طرف اہلِ قلم کو متوجہ کیا۔ اس کا اثر صرف سمینار تک محدود نہیں ہے بلکہ اب لوگ اپنے اپنے طور پر اس موضوع پر سوچیں گے جس سے ادب کو بہت فائدہ ہوگا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد ایوب، ڈاکٹر ریحان حسن، ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر سلیم زبیری نے مقالات پیش کیے اور نظامت کا فریضہ محترمہ شاہین اختر نے انجام دیا۔ سمینار کے اختتام پر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام مقالہ نگار، شعرا، صدور، مہمانانِ خصوصی، یونی ورسٹی کے تمام عملے اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

# نواب محسن الملک اور اعظم گڑھ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

اسکول اعظم گڑھ کا وہ سپاس نامہ ہے جو انھوں نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد پر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس پر جو تاریخ درج ہے وہ 23 مارچ 1899 کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نواب صاحب جنوری 1899 میں کالج کے سکریٹری منتخب ہونے کے بعد مارچ 1899 میں اعظم گڑھ تشریف لائے تھے نہ کہ 1898 میں۔ چوں کہ علامہ شبلی کے مذکورہ بالا خط میں محسن الملک کے قیامِ اعظم گڑھ کی مدت تین دن لکھی ہوئی ہے اس لیے اس کی تاریخ کی تعیین 22-21 مارچ سے 25-24 مارچ 1899 کی جا سکتی ہے۔

اس سپاس نامہ کو اصل سے نقل کرنے میں ’دستاویزاتِ محسن الملک‘ کے مرتب نے بڑی بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ کمپوزنگ کی متعدد غلطیاں بالکل واضح ہیں، حتیٰ کہ اس دستاویز کی تاریخ کے اندراج میں بھی کئی فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ چار صفحے کے اس سپاس نامہ کے پہلے صفحے پر 23 اپریل 1898 کی تاریخ درج ہے اور بقیہ صفحات میں 23 اپریل 1899۔ جب کہ اصل سپاس نامے کے اختتام پر 23 مارچ 1899 کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا یہ سپاس نامہ یقینی ہے کہ علامہ شبلی کی ایما ہی سے پیش کیا گیا ہوگا۔ مشمولات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، بہر حال یہ سپاس نامہ شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی تاریخ کا ایک گوشہ ہونے کے علاوہ اپنے مشمولات کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

> ”معلّٰی القاب جناب نواب محسن الملک صاحب!
>
> ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ جو عالی جناب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب کی ایک ادنی شعاع فیض وضیاء مکرمت ہے اور جس کی تمام رفعت و ترقی مولانا ممدوح کی ہمدردی و روشن ضمیری کے خیالات سے وابستہ ہے، نہایت ادب سے دلی جوش کی شادمانی و اٹھتے ہوئے جوش دل کے دلوں کے مسرت سے اس مبارک اور قابلِ فخر موقعے پر جب کہ حضورِ عالی کے کوکب ہمایوں کے ورود نے اس سرزمین کو فلک چہارم کی عزت دی یا یوں کہیے کہ جناب شمس کی عیادت کی تقریب سے خورشید درخشاں نے قدم رنجہ فرمایا کہ اس سے ہمارے مرزبوم کے ہر خار وخس کو رتبہ انا الشرق عطا کیا ہے۔ چند سطور حضور عالی کے قومی خدمات کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں“۔

(دستاویزات محسن الملک، ص347)

بعدازاں 1857 کے بعد کے حالات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی اور کس مپرسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بے بسی بیان کی گئی ہے اور یہ خوف ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانانِ ہند اسپین کے مسلمانوں کی طرح کے حالات کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایسے میں رحمتِ حق نے دو سیدوں کو پیدا کیا۔ پھر پہلے سید سرسیّد احمد خاں کی کاوشوں کا ذکر ہے۔ بعدازاں دوسرے سید نواب محسن الملک کی شخصیت اور فضل وکمال کا بیان ہے۔ اس میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سرسیّد کی وفات کے بعد خوف تھا کہ تحریک علی گڑھ کہیں پژمردہ نہ ہو جائے مگر محسن الملک کی ذات گرامی سے یہ خوف جاتا رہا۔ اصل عبارت یہ ہے:

> ”خلد آشیاں سید مرحوم کی وفاتِ بے وقت و ناگہانی سے ہم بچگانِ اسلام کو اسلامی اوج و شان کی ترقی کی طرف سے ایک قسم کی مایوسی ہو گئی تھی، آپ کے قابلِ تعظیم قوتِ بازو کی ٹوٹنے سے ہم سخت متوحش تھے کہ مبادا ترقی کے ذرائع رک جائیں اور وہ قابلِ فخر مدرسہ سرچشمۂ علم ومعدن فنون محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ جو غفرلہ سرسید مرحوم کی کوششوں کا ثمرہ ہے، اس کی روانی وطراوت اور اس کے ارکان و وصول تعلیم میں کوئی ناخوش گواری و ڈھیل واقع ہو اور اسلامی جماعت کا کوئی حامی ومعین نہ رہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ ہماری مایوسی خوشی سے بدل گئی اور یہ بات اب علانیہ نظر آ رہی ہے کہ قابلِ تعظیم مرے والا اپنے مرتے وقت ودیعتاً اپنے تمام دست و بازو کی قوت، اپنی تمام دلی روشنیاں و روشن ضمیریاں، اپنے تمام متبرک اوصاف و برکات کو حضرت مہدی کے تمام برگزیدہ شمائل، زور آور دست و بازو، مستقل جد و جہد، نورانی دل مصفا و روشن دماغ پر اضافہ کرتا گیا ہے، جس کے قابلِ عظمت و سرگرم کوشش سے یہ صریح آشکار ہے کہ سید مرحوم کی کوششوں سے جو پود لگی تھی وہ جلد تناور درخت ہوگی اور اس کے ثمر سے ان شاء اللہ ایک عالم بہرہ مند و فیض یاب ہوگا اور اس درس گاہ سے جو آپ کے صدقہ محنت میں جو یونیورسٹی بننے والی ہے وہ چشمۂ فیض جاری ہوگا کہ مسلمانانِ ہند کے علمی خزاں خوردہ باغ میں ہمیشگی کی بہار آوے گی“۔

(دستاویزات محسن الملک ص49-348)

اس سپاس نامے کا آخری پیراگراف نواب صاحب کے لیے دعا اور نیک خواہشات کے ساتھ طلبائے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے علی گڑھ سے والہانہ تعلق کا مظہر ہے:

> ”ہم کو آپ کی ہر تمام کوشش و مدرسۃ العلوم کے ساتھ نسبتاً دلی ہمدردی ہے۔ اس طرح پر کہ گویا مدرسۃ العلوم میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں اور حضور عالی جناب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کو بھی حضور مدرسۃ العلوم کا طالبِ علم تصور فرمائیں۔ اب ہماری یہ دعا ہے۔ حضرات! آپ آمین کہیے کہ اے خدا، اپنے رسولِ پاک و نبیِ اکرمؐ کے طفیل میں ہمارے محسن، ہمارے حامی، ہمارے رہنما، ہمارے ناخدا جناب نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب بہادر کو جو ہمارے اعتقاد و یقین سے ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے رہبر ہیں، خضر کی عمر اور نوح کی حیات عطا کر، وائے خدا، اے خدا ہمارے محسن الملک کی اس تکلیفِ راہ اور صعوبتِ سفر کا خیال کر کے اپنے فضل و جلال کے صدقے میں ان کی کوششوں کو کامران اور ان کے دلی ارادوں کو کامیاب کر۔ آمین ثم آمین“۔ (دستاویزات محسن الملک ص350)

یہ سپاس نامہ پیش کرنے کے لیے یقیناً کوئی تقریب نیشنل ہائی اسکول یا شبلی منزل میں منعقد ہوئی ہوگی، مگر اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں، البتہ اس کے متن کے ایک جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔ ممکن ہے انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں اس کی کوئی تفصیل درج ہو۔

یہ سپاس نامہ نواب صاحب کو جس وقت پیش کیا گیا اس وقت علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے علاحدہ ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری منتخب ہو چکے تھے، ممکن ہے علامہ شبلی نے اسے نہ دیکھا ہو مگر اس کے لکھنے میں ان کا مشورہ ضرور شامل رہا ہوگا، کیوں کہ اس وقت تک علامہ شبلی کا جو تعلیمی نظریہ قائم ہو چکا تھا، اس کی بازگشت اس کے صفحات میں صاف سنائی دیتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس:

> ”اور خدا کی مہربانیوں سے کچھ بعید نہیں ہے کہ علی گڑھ کے سرچشمۂ علوم سے لارڈ بیکن کے ساتھ حضرت امام غزالی کی روح بھی خروج کرے۔ اڈلین و میکالے کے ساتھ امام رازی و امام بخاری کی برکتیں بھی اپنا جلوہ دکھائیں“۔

(دستاویزات محسن الملک ص349)

بہر حال نواب محسن الملک کا اعظم گڑھ آنا، قیام کرنا اور (شبلی) نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے بچوں کا سپاس نامہ پیش کرنا اعظم گڑھ کی علمی وتعلیمی تاریخ کا ایک بہت اہم پہلو ہے اور اس کے نتائج بھی اہم اور دوررس نکلے۔ اس پہلو پر پھر کبھی ان شاء اللہ۔

**ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی**
رفیقِ اعزازی دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
E-mail: azmi408@gmail.com, Mob. No. 9838573645

**پروفیسر اقبال حسین نے ایک کتاب ’دستاویزاتِ محسن الملک‘ سرسید اکیڈمی علی گڑہ سے 2007 میں شائع کی ھے، اس میں ایک دستاویز (نمبر 17، اور شمار نمبر 167) ’خط طلبائے اعظم گڑہ‘ کا بھی اندراج ھے. فھرست سے بظاھر ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ایم اے او کالج علی گڑہ میں مقیم طلبائے اعظم گڑہ کا کوئی خط ھے جو انھوں نے نواب صاحب کے نام لکھا ھے مگر دراصل یہ طلبائے نیشنل ھائی اسکول اعظم گڑہ کا وہ سپاس نامہ ھے جو انھو ںنے نواب محسن الملک کی اعظم گڑہ آمد پر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا. اس پر جو تاریخ درج ھے وہ 23 مارچ 1899 کی ھے. اس سے یہ واضح ھوجاتا ھے کہ نواب صاحب جنوری 1899 میں کالج کے سکریٹری منتخب ھونے کے بعد مارچ 1899 میں اعظم گڑہ تشریف لائے تھے نہ کہ 1898 میں. چوں کہ علامہ شبلی کے مذکورہ بالا خط میں محسن الملک کے قیامِ اعظم گڑہ کی مدت تین دن لکھی ھوئی ھے اس لیے اس کی تاریخ کی تعیین 22-21 مارچ سے 25-24 مارچ 1899 کی جاسکتی ھے .**

# نواب محسن الملک اور اعظم گڑھ

**محمد الیاس الاعظمی**

سرسیّد احمد خاں (1817-1898) کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ کی کشتی بھنور سے نکالنے والے نواب محسن الملک (1837-1907) بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ ان کی تعلیم قدیم طرز اور مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی علوم بالخصوص قرآن، حدیث اور تاریخ پر ان کی گہری اور عالمانہ نظر تھی۔ وہ اچھے اہلِ قلم اور مصنف بھی تھے۔ ان کا شمار 'تہذیب الاخلاق' کے دورِ اول کے بڑے مضمون نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے کئی کتابیں اور رسالے نکلے اور مقبول ہوئے۔ جن کے نام یہ ہیں:

آیاتِ بینات [چار حصے، مطبوعہ 1870-76]، کتاب المحبت والشوق، مولود شریف مطبوعہ 1860، تقلید اور عمل بالحدیث، اشاعتِ اسلام، مطبوعہ 1892 امرتسر، فطرت اور قانونِ فطرت غیر مورخہ، مکاتبات الخلان، مضامین تہذیب الاخلاق وغیرہ۔

وہ اپنے عہد کے بہت مشہور خطیب و مقرر تھے اور نہایت عالمانہ تقریریں کرتے تھے۔ ان کے متعدد خطبات کتابچہ کی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کے 84 خطبات کا ایک مجموعہ 'مجموعۂ لکچرز و اسپیچز' 1905 میں ملک فضل الدین تاجرِ کتب قومی کتب خانہ لاہور نے شائع کیا۔

ان کے خطبات بڑے اہم قومی و ملی مسائل پر مشتمل ہیں۔ ان میں 'اشاعتِ اسلام' کو خاص طور سے بڑی مقبولیت ملی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں تعلیمی و ملی معاملات اور جدید تعلیم کی حمایت میں انھوں نے جو خطبات دیے ہیں وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے بڑے باخبر اور ایک بڑے دانشور تھے۔ ان کی نظر نہ صرف ہندستان کے مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر تھی بلکہ وہ عالمِ اسلام پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ افسوس وہ جس پایے کے شخص تھے ان کے شایانِ شان انھیں خراجِ عقیدت آج تک نہیں پیش کیا گیا۔ محمد امین زبیری (1870-1958) کی 'حیاتِ محسن' مطبوعہ 1934 ان کے تمام کارناموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے، اسی طرح مولانا سیّد امجد علی اشہری کی کتاب 'حیاتِ جاودانی' بھی ان کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے۔ اہلِ قلم بالخصوص علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے فرزندوں پر یہ قرض بہرحال باقی ہے۔

نواب محسن الملک سرسیّد کے بعد علی گڑھ تحریک کی دوسری بڑی اور نمائندہ شخصیت تھے جن سے علامہ شبلی کے بڑے گہرے روابط اور محبت آمیز تعلقات اخیر تک قائم رہے۔ دونوں تاحیات ایک دوسرے کے مداح رہے اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔

نواب محسن الملک نے اپنے ایک خطبہ میں علامہ شبلی کو طلباے علی گڑھ کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا ہے اور ساتھ ہی طلبہ کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''اے میرے عزیز! اے میرے مدرسۃ العلوم کے طالب علمو! نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے۔ تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جب کہ تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو۔ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے میں دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو۔ تمھارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے، تمھارے دلوں کو منور کرنے کے لیے ایک آفتاب روشن ہے، تم ایسا وقت ہاتھوں سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے خصائل اور صفت سیکھنے اور علم کے حاصل کرنے اور پھر اسے کام میں لانے کی کوشش کرو تاکہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کو دیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سیکڑوں چاند اور ستارے نظر پڑیں، خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہے اور اس کا سایہ ہم پر پڑے''۔
>
> (حیاتِ شبلی، ص273)

جنوری 1899 میں سید محمود کی جگہ نواب محسن الملک کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس وقت علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم اور علیل تھے۔ چناں چہ نواب محسن الملک نے اپنے دوست کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ یہ سفر اس وقت اتنا آسان نہ تھا جیسا کہ ہمارے عہد میں ہے۔ باوجود اپنے دوست کی محبت انھیں کشاں کشاں اعظم گڑھ کھینچ لائی۔ سکریٹری شپ ملنے کے بعد غالباً یہ نواب صاحب کا پہلا سفر تھا۔ وہ مارچ 1899 میں اعظم گڑھ آئے اور تین دن 'شبلی منزل' میں قیام کیا۔

جنوری 1899 میں سید محمود کی جگہ نواب محسن الملک کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس وقت علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم اور علیل تھے۔ چناں چہ نواب محسن الملک نے اپنے دوست کی عیادت کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ یہ سفر اس وقت اتنا آسان نہ تھا جیسا کہ ہمارے عہد میں ہے۔ باوجود اپنے دوست کی محبت انھیں کشاں کشاں اعظم گڑھ کھینچ لائی۔ سکریٹری شپ ملنے کے بعد غالباً یہ نواب صاحب کا پہلا سفر تھا۔ وہ مارچ 1899 میں اعظم گڑھ آئے اور تین دن 'شبلی منزل' میں قیام کیا۔

علامہ شبلی نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ''پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے۔ نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے۔ ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کرسکا۔'' (مکاتیبِ شبلی، ج1، ص41)

علامہ شبلی کے اس خط پر تاریخ کے بجائے محض سنہ 1898 درج ہے۔ علامہ شبلی خطوط پر مکمل تاریخ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے، مگر کبھی کبھی بلا تاریخ بھی خط لکھ دیتے تھے، جیسا کہ مکاتیبِ شبلی کے دونوں حصوں میں بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا خط پر سنہ 1898 درج ہونے کی وجہ سے مولانا سیّد سلیمان ندوی نے 'حیاتِ شبلی' میں نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد کا ذکر اسی سنہ کے ذیل میں کیا ہے۔

(حیاتِ شبلی، ص349)

پروفیسر اقبال حسین نے ایک کتاب 'دستاویزاتِ محسن الملک' سرسید اکیڈمی علی گڑھ سے 2007 میں شائع کی ہے، اس میں ایک دستاویز (نمبر 17، اور شمار نمبر 167) 'خط طلباے اعظم گڑھ' کا بھی اندراج ہے۔ فہرست سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں مقیم طلباے اعظم گڑھ کا کوئی خط ہے جو انھوں نے نواب صاحب کے نام لکھا ہے مگر دراصل یہ طلباے نیشنل ہائی

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***